''جستجو کیا ہے؟'' تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

محمد شہباز

Abstract:

Intizar Hussain remains a metaphor for artistic excellence and intellectual curiosity. In the article under consideration, the writer has tried to decipher and analyze his autobiography. The approach is research oriented. Moreover, this scribe has examined Intizar Hussain's autobiography in the light of his art and the way he generally takes up his subjects. Many of literary trends and traits that signify themselves in Intizar Hussain's writings have also crept into his autobiography. The writer has tried to remain objective and balanced in this regard. A conscious effort has been made not only to analyze the work but also to offer a window to admirers of Intizar Hussain, the man and the artist, to have their measure of the man and his work in question.

ہر شخص اپنی زندگی میں کم از کم ایک کتاب یقینی طور پر تصنیف کر سکتا ہے، بہ شرطے کہ اُس کی زندگی میں ایسے اعمال و افعال ضرور وقوع پذیر ہوئے ہوں، جو دوسروں کی دل چسپی کا باعث بن سکیں۔ مزید یہ کہ اُسے اُن چشم دید واقعات و حادثات اور مشاہدات و تجربات کے بیان کرنے کا سلیقہ بھی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اپنی زیست کا احوال خود قلم بند کرنے کا عمل خود سوانح کہلاتا ہے، جسے عرفی معنوں میں'' آپ بیتی'' کہتے ہیں۔(۱) آپ بیتی کے لیے انگریزی میں''Autobiography'' کا لفظ مستعمل ہے، جس کے معنی سرگزشت، خود سوانح یا خود نوشت سوانح حیات کے ہیں۔ بہ غرضِ تفہیم آپ بیتی کے لیے پنجابی زبان کا لفظ ''ہڈ بیتی''(۲) بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔آ کسفورڈ انگلش ڈکشنری میں'' آپ بیتی'' کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "The writing of one's own history, the story of one's life written by himself"(۳)

جب کہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''آپ بیتی'' کی تعریف کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''(آپ بیتی سے مراد) وہ تصنیف (ہے) جس میں مصنف نے اپنے حالاتِ زندگی خود قلم بند کیے ہوں۔''(۴)

یہاں اِس بات کی توضیح بھی ناگزیر ہے کہ ''آپ بیتی''(Autobiography) اور'' سوانح عمری'' (Biography) میں بالعموم کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔اورستم بالائے ستم یہ کہ'' مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے مصداق بہ بانگِ دہل یہ فرمان جاری کر دیا جاتا ہے کہ'' آپ بیتی ''اور'' سوانح عمری'' میں صرف ''صیغہ''(Person) کا فرق ہے۔ اِس بیان میں موجود جزوی صداقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا،مگر فی الاصل یہ دونوں اصنافِ ادب اصطلاحاً اور مزاجاً ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں اور دونوں کو ایک یا ایک جیسا قرار دینا حقیقت سے اغماض برتنے کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ خودنوشت سوانح حیات بھی ایک طرح کی سوانح عمری ہی ہوتی ہے،لیکن اِن دونوں کے درمیان مبادی فرق یہی ہے کہ آپ بیتی میں بجائے کسی دوسرے کی زندگی کو احاطۂ تحریر میں لانے کے اپنی نجی زندگی کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔(۵)

اُردو میں خودنوشت سوانح حیات کی روایت کا سرسری جائزہ لیا جائے تو محمد جعفر تھانیسری کی'' تاریخِ عجیب'' ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر''، دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش''، ابوالکلام آزاد کی ''تذکرہ''، مولانا حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ''، جوش ملیح آبادی کی''یادوں کی برات''اوراحسان دانش کی''جہانِ دانش'' سے لے کر انتظار حسین کی آپ بیتی ''جُستجو کیا ہے؟'' تک ایک واضح روایت تو ضرور دکھائی دیتی ہے،مگر باقی اصنافِ ادب کے مقابلے میں آپ بیتی کا سرمایہ انتہائی کم ہے۔انتظارحسین جو اِس سے پہلے بھی ''چراغوں کا دھواں''(۶) نامی ایک آپ بیتی تحریر کر چکے ہیں،اب ''جُستجو کیا ہے؟'' لکھ کر اُنھوں نے گویا ''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!'' کی مکرر صورت خود ہی پیدا کر لی ہے۔مؤخر الذکر آپ بیتی کا عنوان اُنھوں نے غالبؔ کے حسبِ ذیل شعر سے اخذ کیا ہے:

''جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کُریدتے ہو جو اب راکھ ، جُستجو کیا ہے'' (۷)

عنوان کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اِس کا استفہامی انداز نہ صرف انتظارحسین کی متجسس طبیعت کے در وا کرنے میں قاری کی دست گیری کرتا ہے،بل کہ مصنف کی باطن کشائی کا نقیب بن کر قاری کو دعوتِ نظارہ بھی دیتا ہے،جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

''بار بار وہاں کیا لینے جاتے ہو یا کیا ڈھونڈنے۔بس کرو،کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے۔''(۸)

زیرِنظرخود نوشت سوانح حیات کا بنیادی نکتہ اُجڑی ہوئی تہذیب کی بازیافت ہے،جس میں رنگ ریز، تیلی، کبابی،صراف،حلوائی،سپیرے،کنجڑے،فقیر، پرچون فروش، پاپڑ فروش اور گزک فروش تہذیبی زندگی کی بساط بچھائے اپنی اقتصادی دنیا میں مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔چوں کہ مصنف نے تقسیمِ ہند کا اعصاب شکن مرحلہ

اپنی آنکھوں سے دیکھا،جس کا اُن کی شخصیت پر گہرا اثر ہوا۔یہی وجہ ہے کہ واقعاتِ ہجرت کے بیان میں اُن کا لب ولہجہ حب الوطنی کی چاشنی میں رچا ہوا ہے،جو حالات کی تلخی اور دُرشتی کو گوارا بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔انتظار حسین جنھوں نے اپنا بچپن،لڑکپن اور کسی حد تک جوانی کا بھی کچھ حصہ میرٹھ اور اِس کے گردونواح میں گزارا،مگر تقسیمِ ہند کے بعد وہ تمام لوگ،عزیز رشتہ دار،خصوصاًوہ تہذیب جو اُن سے چھن گئی ،اُس کی یاد اُن کے دل میں ہمیشہ پھانس بن کر چبھتی رہی۔وہ اُسی گم گشتہ تہذیب کی تصویر کشی کے توسط سے خود طمانیت اور باطنی آسودگی کا بندوبست کرنے کی سعی کرتے ہیں۔اِسی امر نے اِس آپ بیتی کو تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔اُسی مخصوص سماجی وتہذیبی زندگی کی شکست و ریخت کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے:

> ’’گزرتے گزرتے ایک چبوترے کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ارے یہ تو وہی چبوترہ ہے جہاں رنگریز ناندوں میں نیلے پیلے کپڑے رنگتے نظر آتے تھے مگر وہ رنگریز کہاں چلے گئے اور ہاں یہ تو اس تیلی کا دروازہ ہے جس کی دوباری میں مستقل کولہو چلتا رہتا تھا۔کڑوا تیل اور کھل۔یہ اس کا کاروبار تھا۔اے لو وہ نکڑ آ گیا جہاں مردان کبابی نے اپنی ٹھیک بنا رکھی تھی۔کتنے لذیذ کباب بناتا تھا۔‘‘(۹)

بکھری ہوئی تہذیب کی کھوج کے علاوہ اِس آپ بیتی میں ماضی کی بازیافت کا پہلو بھی بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے،جس میں اُجاڑ مندر، پرانی مسجدیں، قلعے،جن،ناگ،لنگور، گیدڑ، بندر، تیتر، کبوتر، طوطے، دادر(مینڈک)مور، پپیہے، کوے، فاختائیں،کوئل اور بلبل یادِ عہدِ رفتہ کی علامت بن کر مصنف کے دل کو گدگداتے ہیں۔انتظار حسین کا قصہ بھی دراصل ایک کھوئے ہوئے وقت اور اُس کے آشوب کی کہانی ہے،یعنی وہ وقت جو اُنھیں کبھی حاصل تھا اور جو اپنے ہی سفر کی گرد میں کہیں گم ہو چکا ہے،جس کے آئینے میں وہ اپنے آپ کو بھی دیکھتے ہیں اور اپنے زمانے کو بھی۔(۱۰)انتظار حسین جن پر قدامت پرست، ماضی پسند اور نوسٹیلجیائی(Nostelgiac) ہونے کا الزام دھرا جاتا ہے،اِس ضمن میں وہ خود اپنے سفرنامے ’’نئے شہر پرانی بستیاں‘‘ میں رقم طراز ہیں:

> ’’ویسے میرا بھی یہی خیال ہے۔میں اپنی قدامت پسندی میں اب اتنا راسخ ہو چکا ہوں کہ نئی تہذیب پہ بنا یہ آشیانہ کہ سوڈیڑھ سو سال سے ہماری آرزوؤں کا مکہ بنا ہوا ہے،اب میرا کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا۔یہ بات میں نے اپنی نجی داخلی صورت حال پر بھروسا کر کے کہی ہے،مگر نئے خارجی حالات سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔‘‘(۱۱)

اِس بحث میں اُلجھے بغیر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ماضی سے کٹ کر جینا،قدامت سے قطع تعلق ہو جانا یا نان نوسٹیلجک (Non Nostelgiac) ہو کر زندگی کرنا کسی بھی سطح پر ممکن نہیں۔سو مذکورہ بالا اعتراضات کی روح اِسی ایک دلیل سے فنا ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے ماضی کے مشاہدات و تجربات اور تہذیبی اقدار و روایات سے الگ ہو کر جی ہی نہیں سکتا۔ اِس لیے انتظار حسین کے ہاں ماضی کی بازیافت کو گناہ کے پلڑے میں رکھنا یا اُنھیں نوسٹیلجیائی مریض قرار دینا بہ ہر حال صحت مندانہ رویہ معلوم نہیں ہوتا۔اِس کے برعکس اُن کے ہاں عہدِ رفتہ کو یاد کرنے کی

روشِ قاری کو ایک نیا ہی لطف عطا کرتی ہے:

''جب ایک گلی میں مڑ کر اس مندر میں قدم رکھا تو حیرانی کے ساتھ ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ارے وہ جو جادو بھری اجاڑ جگہ تھی،وہ کہاں گئی۔یہ تو آباد مندر ہے۔کس شدت کے ساتھ مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کی چامنڈا یاد آئی۔اردگرد اجڑا اجڑا سا،بیچ میں مندر کے نام پر بس ایک چہار دیواری۔چھوٹی سی ایک چھت تلے ایک مورتی ایسی بد حال جیسے پجاری اسے یہاں رکھ کر بھول گئے ہیں۔یہاں نہ کبھی سنکھ بجتا دیکھا گیا،نہ کبھی کوئی پجاری نظر آیا۔''(۱۲)

انتظار حسین جنھیں شدت سے اِس بات کا احساس ہے کہ اُن کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور موجودہ سماج کی کوئی تصویر اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی ،جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کے راستے واپس لا کر اپنی ذات میں نہ سمویا جائے۔وہ بار بار اصرار کرتے ہیں کہ زمانے دو نہیں،یعنی حال اور مستقبل،بل کہ تین ہیں۔یہ تین زمانے جدا جدا حقیقتیں نہیں،بل کہ یہ آپس میں اِس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ اُن کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔آدمی زمانہ ٔحاضر میں سانس لیتا ہے،مگر اُس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوتی ہیں۔یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ ہے۔(۱۳) کوئی بھی ادیب یا شاعر اپنے ماحول اور زمانے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔درحقیقت وہ اپنے عصر میں دوسرے عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیوست اور جذب ہوتا ہے۔وہ اپنے معاشرے کے مسائل اور تلخیوں کو کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے اُنھیں اظہار کی زبان عطا کرتا ہے۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں:

''یہ ممکن ہے کہ کچھ آپ بیتیاں ایسی ہوں جس[جن] میں زمانے کا ذکر کم ہو لیکن عموماً کوئی آپ بیتی ایسی نہ ملے گی جو اپنے عہد کے حالات اور ماحول سے بالکل بے نیاز ہو۔کسی آپ بیتی سے متعلقہ دور کے خط و خال کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے اور تصویر سازی میں مدد ملتی ہے۔''(۱۴)

یہ آپ بیتی دراصل ایک عہد کی زندہ تصویر ہے،جس میں (ڈبائی کے گجّی خور جنوں کے علاوہ) گوشت پوست کے حقیقی انسان دکھائی دیتے ہیں اور بلا مبالغہ انتظار حسین نے اِس آپ بیتی میں عصری شعور کی تصویریں بڑی مہارت سے مصور کی ہیں۔عصری آگہی پر مبنی اِس مثال میں دیکھیے کہ مصنف نے بدامنی، بربریت،سفاکی اور ٹارگٹ کلنگ کا نقشہ کس انداز میں کھینچا ہے:

''ویسے تو سارے بنی آدم ایک ہی کنُم ہیں۔ باوا آدم اماں حوا کی اولاد۔مگر دیکھو تو اب ایک دوسرے کو پہچاننے کے روادار نہیں۔ایک دوسرے کا خون بہانے کے لیے ہر وقت تیار۔باوا آدم اور اماں حوا آج آ کر دیکھیں تو اپنی اولاد کو دیکھ کے سر پیٹ لیں مگر خیر سر پیٹنے کی نوبت تو ان کے جیتے جی آ گئی تھی۔قابیل نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا کیا۔وہ تو یہ کہیے کہ ایک کوے نے اس کی بُدھی میں یہ بات ڈالی کہ بھائی کو مار کے اس کی لاش کو کاندھے پر لادے لادے

پھرنا کوئی خوبی کی بات نہیں۔گڑھا کھود کے اسے اس میں داب دو۔کچھ تو جرم پہ پردہ پڑ جائے مگر اب جو ہم جنسوں ،ہم وطنوں،ہم مذہبوں کو ہلاک کرنے کے نئے نئے طریقے برتے جا رہے ہیں۔یہ کس نے انہیں سکھائے۔کوا تو بہر حال اس کا ذمہ دار نہیں۔ہماری ایا اماں کہا کرتی تھیں کہ ارے،اپنا مارے گا تو لاش کو چھاؤں میں تو ڈالے گا۔غلط،ایا اماں غلط۔ذرا آپ یہاں آکر دیکھیں۔اپنے لوگ اپنوں کو کیسے مار رہے ہیں اور قتل گاہوں میں یہاں سے وہاں تک کہیں چھاؤں نہیں ہے۔''(۱۵)

مصنف نے ماضی کی یادوں کو از سرِ نو زندہ کرتے ہوئے پاک ٹی ہاؤس کی پُر بہار محفلوں کو بہت یاد کیا ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اِس آپ بیتی میں جہاں بھی پاک ٹی ہاؤس کا تذکرہ آیا ہے،وہاں اُن کے قلم نے بڑے جان دار اور دل کش مرقعے پیش کیے ہیں۔خاص طور پر مجمعوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے تو اُن کے ہاں کہیں کہیں سرشار کی سی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔(۱۶) ایک مثال دیکھیے:

''اور ہاں پاک ٹی ہاؤس۔کیا کہا پاک ٹی ہاؤس۔اک تیرے[تیر] میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ارے سب سے بڑھ کر یہیں تو ہمارا بسیرا ہوا کرتا تھا۔کتنا جھمگٹا رہتا تھا یہاں۔روییے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے۔تصور میں ابھر آئی چہروں کی ایک پوری ندی۔قیوم نظر کا داخل ہونا۔داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پہ سراج صاحب سے کہ مالک و منیجر تھے،بات کرتے کرتے قہقہہ لگانا۔پیچھے پیچھے شہرت بخاری کا اس طرح داخل ہونا کہ بغل میں حلقہ ارباب ذوق کا رجسٹر ہے۔پھر حلقہ والوں کی آمد کا سلسلہ جاری۔انجم رومانی،اعجاز بٹالوی،یوسف ظفر،مختار صدیقی،ضیا جالندھری،امجد الطاف،شیر محمد اختر۔بس وہ اپنی زبان کی لکنت کی وجہ سے مار [کھا] گئے۔ویسے کیا دراز قد شخصیت تھی اور ہاں سجاد رضوی کہ شیر محمد اختر کے برابر بیٹھ جاتے تو شتر گربہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔'' (۱۷)

دورانِ مطالعہ یادوں کا سلسلہ جب بچپن کی سرحد تک پہنچتا ہے تو اِس مقام پر قاری کو انتظار حسین کے حافظے کی داد دینا پڑتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے نہاں خانۂ دل میں اپنے بچپن کی یادوں کو ایمان کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور اِن یادوں کو وہ تا عمر اپنے ساتھ لیے لیے پھرتے رہے اور آخر اِس آپ بیتی کی شکل میں اُنھیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا:

''اے لو اس ذکر پر مجھے اپنی غلیل یاد آ گئی۔میرے چچا تو بندوق سے شکار کرتے تھے اور کیسا کیسا شکار کرتے تھے۔مرغابی سے لے کر ہرن بلکہ نیل گائے تک جو بھی زد میں آ جائے مگر میں اپنی غلیل کے زور پر شکاری بنا ہوا تھا مگر ایسا شکاری جس کی غلیل پر کسی چڑیا کسی پدی کا خون نہیں ہے۔ویسے تو میں پرندے کو تاک کر ہی غلیل چلاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ غلہ پرندے کے پوٹے پر جا کر لگے گا مگر میری غلیل سے نکلا ہوا غلہ کبھی کسی چڑیا کے پوٹے پر جا کر نہیں لگا۔اس

وقت تو بہت محرومی کا احساس ہوتا تھا کہ کبھی ایک پِدڑی بھی نہ ماری مگر تیر انداز بنے پھرتے ہیں مگر اب اپنی غلیل بازی کو دھیان میں لاتا ہوں تو ایک اطمینان ہوتا ہے کہ کسی جاندار کا خون میری گردن پر نہیں ہے۔غلیل سے دھیان کس طرف چلا گیا۔"(۱۸)

مصنف نے اِس آپ بیتی میں حلیہ نگاری سے بھرپور کام لیا ہے۔وہ سراپا نگاری کرتے ہوئے کفایتِ لفظی(Economy of words) کا بہت خیال رکھتے ہیں۔بے جا تفصیل سے احتراز اور لمبے چوڑے بیانات کی بجائے چند مختصر، مگر انتہائی نا گزیر الفاظ میں وہ کردار کا نقشہ کچھ اِس انداز میں کھینچتے ہیں کہ اِس کا ظاہرو باطن،حسن و قبح اور اُس کے اعمال و افعال آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں،جس کی بدولت پیش آمدہ احوال و واقعات کی تفہیم قاری کے لیے کسی قدر سہل ہو جاتی ہے۔اُنھوں نے جن مختلف احباب کی سراپا نگاری کی ہے،اُن کی گویا لفظی تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ وہ جس شخصیت سے ہمیں متعارف کروانا چاہتے ہیں،اُس کی مکمل شبیہ ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔ پروفیسر چٹرجی جو بعد میں ترقی پا کر میرٹھ کالج کے پرنسپل بن گئے تھے، اُن کا حلیہ ملاحظہ ہو:

"لمبا قد، بنگالی تھے مگر گورے چٹے۔ بر میں بنگالی طرز کا کُرتا۔ سفید بگلاسی دھوتی۔مگر ایک دفعہ عجب رنگ سے کالج میں داخل ہوتے دیکھا۔ ننگے پاؤں، سر پہ استرا پھرا ہوا صرف چوٹی برقرار۔ باقی چندیا صاف۔ پتہ چلا کہ ان کے پتا جی سورگباشی ہو گئے ہیں۔ بیٹا باپ کا سوگ منا رہا ہے۔جس روز جوتی پہن کر آئے اس روز جانا کہ سوگ کے دن ختم ہوئے۔سوگ کی جو ریت رسمیں ہوتی ہیں وہ پوری ہوئیں۔ اب پیروں میں جوتی ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"(۱۹)

اِس آپ بیتی میں مصنف نے افسانوی تکنیک سے کام لیتے ہوئے جذبات نگاری کے بڑے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں،جنھیں پڑھ کر قاری کو افسانے اور ناول دونوں اصناف کا یکساں لطف میسر آتا ہے۔اِس مثال میں جذبات کی شدت دیکھیے:

"آفاق" کے واسطے سے بیان کرنے کو اور کیا کیا کچھ ہے مگر آخر کو اس اخبار کے ساتھ پھر وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔اب کے بھی "آفاق" نے لمبی عمر نہیں پائی۔خیر اس میں "آفاق" کی تخصیص نہیں ہے۔پاکستان میں صحافت کی روایت ہی کچھ اس طرح کی ہے۔بعض مائیں اولاد کے معاملے میں بہت بدنصیب ہوتی ہیں۔بچے تو جنتی ہیں اور بچے بہت ہونہار بھی نکلتے ہیں۔ چشم بددور شباب بھی بھر کر آتا ہے مگر کمبخت عمر دغا دے جاتی ہے۔عین بھری جوانی میں گزر جاتے ہیں۔"(۲۰)

انتظار حسین کی تحریروں میں اِس خوبی کا تذکرہ کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اُن کا دل رنگ، نسل، مذہب، مسلک،قوم اور ذات برادری ایسی غلاظتوں سے صریحاً پاک ہے۔ اِس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں تمام

مذاہب کا احترام بہ درجہ غایت پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں اُنھوں نے اِس خود نوشت سوانح حیات میں ہولی، دیوالی، رام لیلا، عیدین، گیارہویں، شبِ برات اور ربیع الاول ایسے تہواروں کا تذکرہ بغیر کسی مذہبی تعصب کے یکساں انداز میں کیا ہے، جو اُن کی وسیع القلبی اور وسعتِ نظری پر دال ہے:

''بس بس انتظار حسین۔حکایت کو اتنا بھی نہ بڑھاؤ کہ اسے ہضم کرنا دشوار ہو جائے۔محرموں میں محرم لکھنؤ کے۔تم نے تو اپنی ڈبائی کے محرم کو لکھنؤ کے محرم کے مقابل لا کھڑا کیا اور شبِ برات کی ساری حکایت سنا دی۔یہ بتایا ہی نہیں کہ تر تراتے حلوؤں کے بیچ مسور کی دال کی کیا لم ہے اور عید کی سویاں۔تم نے محققوں کی اس بات پہ کوئی کان نہیں دھرا کہ یہ تو تم لوگوں نے رکھشا بندھن منانے والوں سے مستعار لی ہیں۔'' (۲۱)

زیرِ مطالعہ آپ بیتی بعض مقامات پر اچھی خاصی تحقیقی تصنیف کا رنگ پیش کرنے لگتی ہے، جب انتظار حسین ایک منجھے ہوئے محقق کی طرح واقعات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اُن کی اِن تحقیقی کرنوں سے ادب کے طالب علم کماحقہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور محققوں کو بھی کئی کام کی باتیں ہاتھ لگ سکتی ہیں:

''امتیاز صاحب (خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائریکٹر) بتانے لگے کہ یہاں اکیس ہزار ایک سو پچیس مخطوطے ہیں۔کسی ایک زبان میں نہیں مختلف زبانوں میں۔عربی، فارسی، اردو، ترکی، پشتو، سنسکرت، ہندی۔سنسکرت کے مخطوطے پتروں پر لکھے ہوئے چالیس کی تعداد میں ہیں۔باقی مطبوعہ کتابیں ڈھائی لاکھ کی تعداد میں ہیں اور بھلا کونسی کونسی زبانوں میں ہیں۔عربی، فارسی، ہندی، اردو، پنجابی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی۔' (۲۲)

جہاں تک انتظار حسین کے اسلوب کا تعلق ہے تو بلاشبہ اُن کا اسلوب بڑا جان دار اور توانا ہے۔اُن کا تمثیلی لب و لہجے پر مبنی اسلوب، جس میں تلمیحات، قرآنی حکایات، قصص الانبیا، اسلامی تاریخ کے واقعات، مذہبی روایات، اقوالِ زریں، ملفوظاتِ بزرگانِ دین، اساطیری و دیومالائی کردار اور سرت ساگر کتھاؤں کی دنیا میں آغاز تا انجام قاری بند مٹھی میں تتلی کی طرح اُن کی گرفت میں رہتا ہے۔اُوپر سے اُن کا داستانوی اسلوب سونے پر سہاگہ ایسا کام کرتا ہے۔اُن کے ہاں گھن گرج رکھنے والے الفاظ کی بجائے دھیمے اور ملائم الفاظ ہی جگہ پاتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں انتظار حسین کی زبان پرانے عہد نامے اور داستانوں کی سلیس و سادہ زبان ہے۔(۲۳) مثلاً:

''اس عزیز نے اس بستی کی کہانی یوں سنائی کہ کہتے ہیں کہ اب سے تین سو ساڑھے تین سو برس پہلے یہ ایک بھری پری بستی تھی۔علاقہ کے راجہ نے اس بستی کی ایک سندر کنیا کو تاڑا اور اسے اُٹھوا لیا۔بستی کے باسیوں نے عجب رنگ سے احتجاج کیا کہ راتوں رات وہ بستی سے نکل کر جانے کدھر نکل گئے۔چلتے وقت بد دعا دی کہ اب یہ بستی کبھی آباد نہ ہو۔تب سے یہ بستی اس بد دعا کے اثر میں ہے۔خالی ڈھنڈار پڑی ہے اور ہو حق کرتی ہے۔'' (۲۴)

انتظار حسین خیالات کے ساتھ ساتھ لفظوں کے بھی پارکھ ہیں۔اُنھوں نے ہندی الفاظ کو واقعات و کیفیات

کے اظہار کے لیے کچھ اِس مہارت سے استعمال کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔مثلاً:درشن،یاتری،مرتیو،شبھ گھڑی،لکشمن ریکھا،جے بھگوان،مہاشے،سبھا،انت،بیکھنٹ،سورگ،سمبندھ،شِشش، آدرش،شُد ھ کلا،جے جے کار، منڈلی، مہورت، شردھا،بھاشن،آرتی،ہندیاترا،سمارو،سپھل،وشال دھرتی، سواگت،اپدیش،پرنام،کشٹ،پوتر،پرمپرا، راجا پرجا، دشاؤں،استری، پتی، ارتھیاں، رکھشا بندھن، پنگھٹ، اشیرواد،اشنان،سورگباشی ،بُدھی،رام نام ستیہ ہے، پریوار، سورگ اور ماتا پِتاایسے ہندی الفاظ کے استعمال سے اُن کے اسلوب میں انفرادیت کا جوہر پیدا ہوگیا ہے۔ذرا یہ مثال دیکھیے:

> ''بتایا کہ یہ وہ استھان ہے جہاں بدھ جی مہاراج نے گیان کی روشنی پانے کے بعد اپنا پہلا اپدیش دیا تھا۔وہ استھان دیکھا،گھوم پھر کر اس جگہ کو دیکھا۔اس سے تو یہاں ہرن بن تھا مگر اب وہاں نہ ہرن ہیں، نہ ہرن بن ہے، نہ وہ جوگی ہیں جنھیں بدھ جی نے اپنے گیان بھرے اپدیش سے رام کیا تھا۔''(۲۵)

اُنھوں نے کہیں کہیں متروک الفاظ کے ذریعے بھی اپنی تحریر کا حسن دوچند کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔مثلاً:

> ''بولی''بس محرم کے محرم کچھ لوگ یاں پہ آتے ہیں۔محرم کے بعد پھر تالا پڑجاوے ہے۔''(۲۶)
>
> ''آخر کے تیئں میں نے اپنی گم شدہ بستی کو پالیا۔''(۲۷)
>
> ''میرے ہوش سنبھالتے سنبھالتے انہوں نے بھی آنکھیں موندلیں۔''(۲۸)

کسی بھی زبان میں محاورات کی اہمیت مسلمہ ہے۔جومفہوم طویل عبارتوں میں ادا کرنا مشکل ہوتا ہے، وہ ایک محاورے میں مختصر ترین الفاظ میں ادا ہوسکتا ہے۔اسی لیے اہلِ زبان اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے محاورات کا سہارا لیتے ہیں۔انتظارحسین نے بھی اِس آپ بیتی میں محاورات کا استعمال ممکن حد تک بے ساختہ انداز میں کیا ہے،لیکن یاد رہے کہ مولوی نذیر احمد کی طرح اُن کے ہاں محاورات کے استعمال میں ''ٹھونسا ٹھانسی'' کا عمل کارفرما ہونے کی بجائے اظہار کا ناگزیر تقاضا معلوم ہوتا ہے۔اِس خودنوشت سوانح حیات میں مصنف نے محاورات کو اپنے اسلوب میں نگینوں کی طرح جڑنے کا فریضہ انجام دیاہے۔مثلاً: چکنم میں پڑنا(ص۱۰)،قلانچیں بھرنا(ص۱۵)،سٹک جانا(ص۱۶)،چمپت ہونا(ص۱۶)،نال گڑنا(ص۵۶)،تھڑی تھڑی ہونا(ص۶۴)،سانپ کے منہ میں چھچھوندر(ص۹۵)،نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے(ص۹۵)،اندھے کے پاؤں کے نیچے بٹیر آنا (ص۹۵)،منہ میں گھنگھنیاں ڈالنا(ص۹۵)،سوکھے دھانوں پہ پانی پڑنا(ص۱۳۲)،ناک کا بال(ص۱۳۴)،تین حرف بھیجنا(ص۱۵۴)،گونگے کا گڑکھانا(ص۱۵۸)،بے بھاؤ کی پڑنا(ص۱۶۹)،ریشۂ ختمی ہونا(ص۱۷۸)،ڈھاک کے تین پات(ص۲۹۰)، اٹکل پچو جواب دینا(ص۱۸۳)،تام جھام لے کر(ص۱۹۵)،تلوے میں کھجلی ہونا(ص۲۶۰) اور دل بلیوں اچھلنا (ص۲۲۷)ایسے محاورات اِس آپ بیتی کے گلے کا ہار معلوم ہوتے ہیں۔

اِس خودنوشت سوانح حیات میں انتظارحسین نے جگہ جگہ اُردو اور فارسی کے جو اشعار ٹانکے ہیں،وہ بھی خوب

مزا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے برجستہ مصرعوں اور شعروں کا استعمال پوری آزادی کے ساتھ کیا ہے، تاہم بعض اوقات انسانی حافظہ قابلِ اعتماد دوست ثابت نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اشعار کے درج کرنے میں مصنف نے ٹھوکر کھائی ہے، جس کی وجہ سے اِس آپ بیتی کا ظاہری حسن کسی قدر متاثر ہوا ہے۔ گوکہ یہ معاملہ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' کے زمرے میں آتا ہے، تاہم ذیل میں ایسے اشعار کی درستی کی گئی ہے، جو آپ بیتی میں صحتِ متن کے ساتھ نقل نہیں کیے گئے:

(غلط شعر) ؎ دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
بنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (۲۹)

(درست شعر) ؎ دکھن سا نہیں ٹھار سینسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (۳۰)

(غلط شعر) ؎ دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے (۳۱)

(درست شعر) ؎ دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے (۳۲)

(غلط شعر) ؎ دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کی حرمت نگینہ ہی لگ (۳۳)

(درست شعر) ؎ دکھن ہے نگینا انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہے لگ (۳۴)

(غلط شعر) ؎ کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بےنوائے سراؔج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خبری رہی (۳۵)

(درست شعر) ؎ کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بےنوائے سراؔج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی (۳۶)

(غلط شعر) ؎ دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستاں ہوتے ہیں (۳۷)

(درست شعر) ؎ دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستان ہوتے ہیں (۳۸)

(غلط شعر) ؎ اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا (۳۹)

(درست شعر) ؎ اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا (۴۰)

(غلط شعر) ؎ فکرِ معاش، ذکرِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس مختصر حیات میں کیا کیا کرے کوئی (۴۱)

(درست شعر) ؎ فکرِ معاش وعشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے (۴۲)

(غلط شعر) ؎ کانٹا لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے (۴۳)

(درست شعر) ؎ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے (۴۴)

(غلط شعر) ؎ یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے (۴۵)

(درست شعر) ؎ یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے (۴۶)

(غلط شعر) ؎ جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشنی کرے گی نام مرا سوختہ تنی (۴۷)

(درست شعر) ؎ جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی (۴۸)

(غلط شعر) ــــ یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں رہتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے (۴۹)

(درست شعر) ــــ یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے (۵۰)

(غلط شعر) ــــ وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا (۵۱)

(درست شعر) ــــ وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا (۵۲)

(غلط شعر) ــــ اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک نہ کیوں کیا میں نے (۵۳)

(درست شعر) ــــ اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے؟ (۵۴)

ایک اور جگہ مصنف لکھتے ہیں:

''بس کچھ اس قسم کا رشتہ جو آتش کے شعر میں بیان ہوا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل'' (۵۵)

گویا انتظار حسین نے مذکور شعر کو آتش سے منسوب کیا ہے، لیکن درحقیقت یہ شعر اُن کے نام ور شاگرد نواب سید محمد خاں رند لکھنوی (۱۲۱۲ھ -۱۲۶۸ھ / ۱۷۹۷ء- ۱۸۵۲ء) کا ہے، جو اُن کے دیوان میں کچھ یوں درج ہے:

''آ عندلیب مل کے کرین آہ و زاریان
تو ہائے گل پکار مین چلاؤن ہائے دل'' (۵۶)

اِس آپ بیتی کا ایک سقم یہ بھی ہے کہ انتظار حسین اپنے موضوع سے گریز کرتے ہوئے بار بار اِدھر اُدھر بھٹک جاتے ہیں اور لمبی لمبی بحثیں شروع کر دیتے ہیں اور جب دیر کے بعد اُنھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے

بعید ہو گئے ہیں، تو پھر وہ اپنے اصل موضوع کی جانب رجوع کرتے ہیں۔یہ خامی اکثر آپ بیتیوں میں پائی جاتی ہے۔بہ قول ڈاکٹر صبیحہ انور:

''آپ بیتی کے موضوعات کے سلسلے میں ایک اور بات بھی اہم ہے وہ یہ کہ اکثر مصنف واقعات کے بہاؤ میں اپنے موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اور بہت دور تک کسی انجانے راہ رو کے ساتھ چلنے کے بعد [اُنھیں] یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر آ نکلے ہیں۔یہ خامی اردو خود نوشت نگاری میں بہت عام ہے۔''(۵۷)

اِس قسم کی بے شمار مثالیں آپ بیتی کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں، جن سے قاری کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر ذیل کے جملے ملاحظہ کیجیے:

''اے لو ذکر تھا ساون بھادوں کا۔بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔''(۵۸)

''لو میں رو میں اپنی اوقات کو بھول کر ادیبوں سے اپنے تعارف کی داستان سنانے لگا۔''(۵۹)

''اے لو یہ تو میں نے تاریخ عروج و زوال حلقۂ ارباب ذوق کی ورق گردانی شروع کر دی۔''(۶۰)

''ارے میں گلڈ کا ذکر کرتے کرتے کہاں سے کہاں نکل آیا۔''(۶۱)

کوئی بھی خود نوشت سوانح عمری بنیادی طور پر تین چیزوں سچائی،شخصیت اورفن سے مل کر تکمیل پذیر ہوتی ہے۔زیرِنظر آپ بیتی میں سچائی اورفن کا وجود تو ملتا ہے،مگر مصنف کی اپنی ذات کے حوالے سے کچھ زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں،یعنی اُن کا خاندانی پس منظر،درونِ خانہ نجی زندگی کے احوال اور وہ کون سے محرکات تھے، جنھوں نے اُنھیں ادب کے راستے پر گامزن کیا؟ یہ سب کچھ شدت سے تشنۂ بیان محسوس ہوتا ہے۔مجموعی طور پر مصنف نے اِس آپ بیتی میں اپنی ذاتی زندگی سے پردہ اُٹھانے کی بجائے سیاحتی امور پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں کہیں نجی باتوں کا ذکر آیا بھی ہے انتظار حسین انتہائی اختصار کے ساتھ آگے بڑھ گئے ہیں اور اُن کے بارے میں جاننے والوں کے اشتیاق کی تشفی ہونے کی بجائے تشنگی بڑھ جاتی ہے۔اُن کی تحریروں اور انٹرویوز میں اول تو اُن کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں اور جہاں کہیں اِس کا موقع آیا بھی ہے تو وہ اسے ٹھوکر مار کر آگے بڑھ گئے ہیں۔(۶۲) گویا اُنھوں نے خاندان کے ذکر میں کسی قدر رخست سے کام لیا ہے، بل کہ عمداً احتراز کیا ہے۔گویا خاندان کے ذکر میں کسی قدر بے تعلقی اور بے زاری کا تاثر ملتا ہے۔ذرا دیکھیے:

''میں تو شجرۂ نسب کی نقل کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں جو میرے بزرگ مجھے عنایت کر گئے تھے مگر یار کہیں گے کہ خاندان کے دور پرے کے عزیزوں ،رشتہ داروں کا اتنا ذکر کیا، کچھ خاص اپنے گھرانے کے متعلق تو بتاؤ۔ارے وہاں بتانے کے لیے کیا ہے۔ایک ماموں،ایک چچا،ایک خالہ۔پھوپھی ندارد۔پانچ بہنیں، بھائی کے نام صفر۔بھانجے بھانجیاں قطار اندر قطار۔بیٹا بیٹی غائب۔لو اب لکھتے ہوئے احساس ہو رہا ہے۔پہلے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کتنے اہم رشتے تو

میری زندگی سے خارج ہیں۔''(۶۳)

انسانی زندگی اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ متصور کی جاتی ہے،جس میں اچھائیوں سے قطع نظر دانستہ یا غیر دانستہ، برے اعمال کا سرزد ہو جانا ایک بدیہی امر ہے ،تاہم اِس آپ بیتی کی ایک اور خامی یہ بھی ہے کہ مصنف نے پوری آپ بیتی میں اپنی ذات کو ہر طرح کی دنیاوی آلائشوں سے پاک یا دوسرے لفظوں میں خود کو ایک فرشتہ صفت انسان کے روپ میں پیش کیا ہے اور کوئی دنیاوی نجاست اپنے دامن پر ظاہر نہیں ہونے دی۔اِس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو:

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اوردوسری وجہ، جو ہماری آپ بیتیوں میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔بہ قول ڈاکٹر تحسین فراقی:

''خود نوشت سوانح میں دو بڑی مشکلات ہیں یا تو یہ شخصیت کا قصیدہ ٔ مدحیہ اور ''کتاب المناقب'' بن جاتی ہے یا کتاب المعائب۔''(۶۴)

انتظار حسین نے یہ آپ بیتی اُس وقت تحریر کی ہے، جب اُن کی عمر آٹھ دہائیوں سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ اِس عمر میں اُن کا قلم تو جوان ہے ،تاہم اکثر و بیشتر واقعات کو بیان کرتے ہوئے وہ نسیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔اِس بات کی تصدیق اُن کے اپنے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے ، جو اُنھوں نے اپنے افسانوی مجموعے''جنم کہانیاں'' میں اپنے افسانوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''افسانوں کی ترتیب میں ان کی اشاعت کی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔بلکہ یوں کیا ہے کہ جس ترتیب سے لکھے ہیں۔اس ترتیب سے جمع کر دیئے ہیں۔حافظہ جہاں تک مدد دے سکتا ہے۔لکھنے کی تاریخیں بھی دے دی گئی ہیں۔لیکن یہ سو فیصدی صحیح تاریخیں نہیں ہیں۔اس لئے کہ میرا حافظہ خاصا کمزور ہے۔''(۶۵)

ہوسکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ بات کسرِنفسی کے ضمن میں کی ہو، تاہم حقیقت یہ ہے کہ اُن کا حافظہ بہ تقاضائے عمر کسی قدر نسیان کا شکار ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''بیدل جالندھری کا ذکر شاید میں نے کہیں پیچھے کیا ہے یا نہیں۔''(۶۶)

''کمیٹی کے ممبران میں عسکری صاحب، اعجاز بٹالوی،حمید اختر اور کون تھا، یاد نہیں آ رہا۔''(۶۷)

''بنگلہ دیش سے آنے والے وفد میں تین بیبیوں کی اپنی ایک ٹولی تھی۔پنا قیصر، روبی رحمٰن، تیسری کا نام میں بھول گیا۔''(۶۸)

''فقرہ لمبا تھا، پوری طرح یاد نہیں رہا۔''(۶۹)

انتظار حسین کی تحریروں میں اِکا دُکا توہم پرستانہ واقعات عمومی طور پر ضرور جگہ پاتے ہیں۔شاید اِس کی وجہ اُن کا داستانوی مزاج ہو۔یوں بھی داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کی بیخ کے بغیر کہانی کا آمیزہ تیار ہی نہیں

ہوتا۔اوہام پرستی کی اِس روِش کا ہلکا سا اظہار اِس آپ بیتی میں بھی ملتا ہے، جو ایک سنجیدہ اور پختہ ذہن قاری کو بہ ہر حال متاثر نہیں کر پاتا:

''ہاں مٹھن لال حلوائی کی دکان بارہ بجے رات تک کھلی رہتی مگر آخر بارہ بجے تک کیوں۔اس سمے تک تو ساری بستی سو جاتی تھی۔وہ اس وجہ سے کہ مٹھن لال کی گجیوں کی شہرت جنات تک پہنچی ہوئی تھی۔روز رات کے بارہ بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی آتا۔بڑا سا پگڑ۔منہ پہ لمبی لمبی مونچھیں۔نہ بولتا [نہ] بات کرتا۔بس دو اشرفیاں اپنا بڑا سا ہاتھ بڑھا کر مٹھن لال کی مٹھی میں تھماتا اور ٹوکری میں گجیاں بھر کر لے جاتا۔مٹھن لال شک میں کہ یہ کون شخص ہے۔ایک روز چوک ہوگئی ''مہاشے جی،تمہارا نام کیا ہے۔''ادھر سے جواب میں تڑاخ سے ایک تھپڑ اور آدمی غائب۔مٹھن لال تین دن بخار میں پھنکتا رہا۔مرتے مرتے بچا۔''(۷۰)

کہیں کہیں مصنف کا لہجہ کسی قدر طنزیہ صورت اختیار کر گیا ہے۔تحریر کا یہ انداز اِس آپ بیتی میں ذرا کم کم ہے،مگر جہاں بھی ہے وہاں بڑا کٹیلا اور براہِ راست نوعیت کا حامل ہے:

''ادھر کنونشن جاری تھا۔کمیٹیاں بیٹھی تھیں اور اپنے اپنے کام میں جتی ہوئی تھیں۔دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔جو اچھل کر سامنے آیا اس کا نام رکھا گیا پاکستان رائٹرز گلڈز۔ویسے تو سٹیج پر سب سے بڑھ کر جمیل الدین عالی نظر آرہے تھے اور اس زور شور سے نظر آرہے تھے کہ مخالفوں کی جلی کٹی سن کر اتنا بھڑ کے کہ بے ہوش ہوگئے۔''(۷۱)

مزید ایک مثال دیکھیے:

''عطاء الحق قاسمی یہاں جن کی سنگت پہلے مستنصر تارڑ سے ہوئی مگر جلد ہی کٹ [گئی]۔البتہ امجد اسلام امجد کے ساتھ سنگت لمبی کھنچی لیکن جب نزاکت علی سلامت علی کی جوڑی سلامت نہ رہ سکی تو یہ جوڑی بھی کتنے دن سلامت رہ سکتی تھی۔سو جلد ہی یاری کٹ ہوگئی۔پھر عطاء الحق قاسمی اپنی راہ امجد اسلام امجد اپنی راہ۔''(۷۲)

مجموعی طور پر یہ آپ بیتی بے ہیئت (Formless) تو نہیں ،مگر واقعات میں تقدیم و تاخیر کی وجہ سے نفسِ مضمون بے ربطی اور انتشار کا شکار دکھائی دیتا ہے۔مزید یہ کہ زیرِ مطالعہ خودنوشت مصنف کی پوری زندگی کا احاطہ بھی نہیں کرتی،یعنی کون سا اہم واقعہ کس سنہ میں ظہور پذیر ہوا ،اِس کی کچھ تفصیل نہیں ملتی۔ واقعات سنین کی قید سے آزاد ہونے کی وجہ سے ادوار کے تعین میں دشواری اور بعض اوقات تفہیمِ واقعات میں رکاوٹ کا احساس بھی ہوتا ہے۔مصنف نے واقعات میں زمانی ترتیب کوملحوظِ خاطر رکھنے کی بجائے بے ترتیبی کا صیغہ پسند کیا ہے،جس کی وجہ سے قاری کے ذہن میں آپ بیتی کی کوئی واضح شکل نہیں بن پاتی۔گویا یہ آپ بیتی کسی حد تک مرکزی تاثر سے بھی خالی ہے:

''اس کے ذکر اذکار میں نے بہت سنے لیکن ان دادا جان اور ان کی آل اولاد کا ذکر مجھے ہاپوڑ

کے ذیل میں کرنا ہے، ابھی نہیں۔'' (۷۳)

ایک اور مثال دیکھیے:

''اور پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ ارے یہ تو وہی بی بی ہیں۔ان سے تو میں مل چکا ہوں۔بھلا کہاں ملا تھا۔منیب الرحمٰن کی نظم میں۔مگر یہ میں زقند لگا کر کہاں آن پہنچا۔یہ سب تو مجھے آگے چل کر بیان کرنا ہے اے لوکب کی ایک اور بات دھیان میں آ گئی۔'' (۷۴)

بات کو سمیٹتے ہوئے یہی کہا سکتا ہے کہ اِس آپ بیتی میں انتظار حسین نے جہاں اپنی جڑوں کے سراغ کے لیے ماضی کی بازیافت کا سہارا لیا ہے، وہاں اُنھوں نے ہندوستانی تہذیب وتمدن، رسوم و رواج اور اس معاشرے میں پائی جانے والی توہمات کو بھی انتہائی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔گویا یہ آپ بیتی مصنف کی سیاسی، سماجی مجلسی، ادبی اور صحافتی زندگی کا ایک ایسا دل آویز مرقع ہے، جس میں مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تنقید وتبصرہ اور تحلیلِ نفسی کے بھی مختلف پہلو دکھائی دیتے ہیں۔مشاہیر رفتگاں کا نوحہ، بدلتے موسموں کی کروٹیں، ادبا وشعرا کی حرکی تمثالیں، سیاسی و سماجی اُتار چڑھاؤ، ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، ادبی سرگرمیوں کا بیان، سیر سپاٹے اور ہندوستان میں مصنف کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریبات کا تذکرہ حد سے سوا تحسین کا متقاضی ہے، تاہم اُردو ادب میں آج تک لکھی جانے والی آپ بیتیوں کے مقابلے میں اِسے ایک شاہ کار آپ بیتی تو قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن یہ خود نوشت سوانح حیات ادبیاتِ اُردو کے ایک قابلِ قدر ادیب کی ذاتی زندگی کے رجحانات و میلانات اور اُردو ادب کی اہم مجالس کی مصوری کا حق ضرور ادا کرتی ہے۔

حوالے اور حواشی:

۱۔ سہیل احمد خان، سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، (تالیف) لاہور: شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵

۳۔ "The Oxford English Dictionary" Oxford at the clarendon Press 1999, Page 573

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۱

۵۔ ریحانہ خانم، سہ ماہی ''الزبیر'' آپ بیتی نمبر، بہاولپور: اُردو اکادمی، ۱۹۶۴ء، ص ۹۰

۶۔ انتظار حسین کی آپ بیتی ''چراغوں کا دھواں (یادوں کے پچاس سال)'' سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے پہلی بار ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ازاں بعد ۲۰۰۳ء اور ۲۰۱۲ء میں بالترتیب اس کا دوسرا اور تیسرا اڈیشن منظر عام پر آیا۔

۷۔ غالب، دیوانِ غالب، مرتب: امتیاز علی خاں عرشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء، ص ۳۲۲

۸۔ انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶۰

۹۔ ایضاً، ص ۹

۱۰۔ شمیم حنفی، انتظار حسین، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، ترتیب: ارتضٰی کریم، ڈاکٹر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۲۹

۱۱۔انتظار حسین،نئے شہر پرانی بستیاں،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء،ص۸
۱۲۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۱۳
۱۳۔گوپی چند نارنگ،انتظار حسین کا فن،مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان،ص۱۴۱،۱۴۲
۱۴۔صبیحہ انور،ڈاکٹر،اُردو میں خودنوشت سوانح حیات،لکھنؤ:نامی پریس،۱۹۸۲ء،ص۶۰۔۶۱
۱۵۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۶
۱۶۔سہیل احمد خاں،دیباچہ،مشمولہ،انتظار حسین،بوند بوند،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء،ص۱۸
۱۷۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۸۲/۲۸۳
۱۸۔ایضاً،ص۴۸
۱۹۔ایضاً،ص۱۷۹،۱۸۰
۲۰۔ایضاً،ص۱۲۹،۱۳۰
۲۱۔ایضاً،ص۴۲
۲۲۔ایضاً،ص۱۹۶
۲۳۔سجاد باقر رضوی،ڈاکٹر،''دیباچہ''مشمولہ،انتظار حسین،آخری آدمی،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء،ص۱۰
۲۴۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۴۵
۲۵۔ایضاً،ص۲۰۶
۲۶۔ایضاً،ص۱۲
۲۷۔ایضاً،ص۱۵
۲۸۔ایضاً،ص۲۳
۲۹۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۲۳
۳۰۔ملاوجہی،قطب مشتری،مرتب:عبدالحق،مولوی،کراچی:انجمن ترقی اُردو،۱۹۵۳ء،ص۸۸
۳۱۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۲۳
۳۲۔ملاوجہی،قطب مشتری،ص۸۸
۳۳۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۲۳
۳۴۔ملاوجہی،قطب مشتری،ص۸۸
۳۵۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۲۱
۳۶۔سراج اورنگ آبادی،کُلیاتِ سراج،مرتب:عبدالقادرسروری،نئی دہلی:ترقی اُردو بیورو،۱۹۸۲ء،ص۶۶۷
۳۷۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۵۳
۳۸۔میرمحمد تقی میر،کلیاتِ میر(جلد اول)مرتب:کلب علی خاں فائق،لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۱ء،ص۳۳۸
۳۹۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۵۸
۴۰۔میرمحمد تقی میر،کلیاتِ میر(جلد اول)،ص۱۶۳
۴۱۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص۲۷۱
۴۲۔سودا،مرزا محمد رفیع،کلیاتِ سودا(جلد اول غزلیات)،مرتبہ:محمد شمس الدین صدیقی،ڈاکٹر،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۹۲ء،
ص۵۰۴

۴۳۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۱۱۷
۴۴۔امیر مینائی،صنم خانہ عشق،کراچی:مسعود پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۴ء،ص ۲۱۶
۴۵۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۱۴۳
۴۶۔ناصر کاظمی،دیوان،لاہور:جہانگیر بکڈ پو،۲۰۰۲ء،ص ۱۵۰
۴۷۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۲۷۶
۴۸۔ناصر کاظمی،نشاطِ خواب،لاہور:جہانگیر بکڈ پو،۲۰۰۱ء،ص ۱۸
۴۹۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۱۳۸
۵۰۔احمد مشتاق،کلیاتِ احمد مشتاق،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء،ص ۹۱
۵۱۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۱۲۸
۵۲۔م۔حسن لطیفی،لطیفیات،لاہور:ادارہ نقوش،۱۹۸۸ء،ص ۴۱
۵۳۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۲۹۵
۵۴۔ن۔م۔راشد،ماورا،لاہور:مکتبہ اُردو،۱۹۸۸ء،ص ۵۸
۵۵۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۲۷۷
۵۶۔رند،نواب سید محمد خان،دیوانِ رند معروف بہ گلدستۂ عشق،لکھنؤ:مطبع منشی نول کشور،۱۹۳۰ء،ص ۲۶۱
۵۷۔صبیحہ انور،ڈاکٹر،اُردو میں خود نوشت سوانح حیات،ص ۳۵۰
۵۸۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۴۷
۵۹۔ایضاً،ص ۹۰
۶۰۔ایضاً،ص ۱۰۶
۶۱۔ایضاً،ص ۱۳۴
۶۲۔ارتضیٰ کریم،ڈاکٹر،(مرتب)،داستان سے دبستان تک،مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان،ص ۱۷
۶۳۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۲۵
۶۴۔تحسین فراقی،ڈاکٹر،عبدالماجد دریا بادی۔احوال و آثار،لاہور:ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ،۱۹۹۳ء،ص ۴۱۴
۶۵۔انتظار حسین،گلی کوچے،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء،ص ۱۲
۶۶۔انتظار حسین،جستجو کیا ہے؟،ص ۱۱۴
۶۷۔ایضاً،ص ۱۱۸
۶۸۔ایضاً،ص ۱۴۰
۶۹۔ایضاً،ص ۱۷۷
۷۰۔ایضاً،ص ۵۰
۷۱۔ایضاً،ص ۱۳۲،۱۳۳
۷۲۔ایضاً،ص ۲۸۵
۷۳۔ایضاً،ص ۲۵
۷۴۔ایضاً،ص ۲۱

کتابیات:

۱۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
۲۔احمد مشتاق، کلیاتِ احمد مشتاق، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
۳۔ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، (مرتب)، انتظار حسین ایک دبستان، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء
۴۔امیر مینائی، صنم خانہ عشق، کراچی: مسعود پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء
۵۔انتظار حسین، بوند بوند، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
۶۔انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
۷۔انتظار حسین، جنم کہانیاں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
۸۔انتظار حسین، چراغوں کا دھواں (یادوں کے پچاس سال)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
۹۔انتظار حسین، نئے شہر پرانی بستیاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
۱۰۔تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریا بادی۔احوال وآثار، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۳ء
۱۱۔رند، نواب سید محمد خان، دیوانِ رند معروف بہ گلدستہ عشق، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ۱۹۳۰ء
۱۲۔ریحانہ خانم، سہ ماہی "الزبیر" آپ بیتی نمبر، بہاولپور: اردو اکادمی، ۱۹۶۴ء
۱۳۔سراج اورنگ آبادی، کُلیاتِ سراج، مرتب: عبدالقادر سروری، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء
۱۴۔سلیم اختر، ڈاکٹر: تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
۱۵۔سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا (جلد اول غزلیات)، مرتبہ: محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء
۱۶۔سہیل احمد خان، سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، (تالیف) لاہور: شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء
۱۷۔صبیحہ انور، ڈاکٹر، اُردو میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء
۱۸۔م۔حسن لطیفی، لطیفیات، لاہور: ادارہ نقوش، ۱۹۸۸ء
۱۹۔ملاوجہی، قطب مشتری، مرتب: عبدالحق، مولوی، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۳ء
۲۰۔میر محمد تقی میر، کلیاتِ میر (جلد اول) مرتب: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء
۲۱۔ناصر کاظمی، دیوان، لاہور: جہانگیر بکڈ پو، ۲۰۰۲ء
۲۲۔ناصر کاظمی، نشاطِ خواب، لاہور: جہانگیر بکڈ پو، ۲۰۰۱ء
۲۳۔ن۔م۔راشد، ماورا، لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۸۸ء
۲۴۔ "The Oxford English Dictionary" Oxford at the clarendon Press,1999